جلد02شمارہ۱۸،۲۰۲۴

Article

Research Ethics

اخلاقیاتِ تحقیق

Dr. Muhammad Saeed*[1] , Dr. Syeda Misbah Rizvi[2], Rao Muhammad Umer[3]

[1] Associate Professor, Department of Urdu, Govt. College University, Lahore

[2] Associate Professor, Department of Urdu, Govt. College University, Lahore

[3] Lecturer,Govt. Islamia Post Graduate College Civil Lines, Lahore

*Correspondence:

ڈاکٹر محمد سعید،[1] ڈاکٹر سیدہ مصباح رضوی،[۲] راؤ محمد عمر،[۳]

[۱] ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور، [۲] ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور،

[۳] لیکچرار، گورنمنٹ اسلامیہ پوسٹ گریجوایٹ کالج، سول لائنز، لاہور

eISSN: 2073-3674
pISSN: 1991-7813
Received:07-۰7-202٤
Accepted:15-۰9-202٤
Online:۲۷-۰9-202٤

Copyright: © 2023 by the authors. This is an open-access article distributed under the terms and conditions of the Creative Common Attribution (CC BY) license

Abstract: Research is the name of the discovery and retrieval of facts and truths. This process requires deep scientific awareness and high ethical values. In the research process, the researcher also has an ethical responsibility to give credit for the work of the person whose work he uses during the research. But unfortunately, in the tradition of research in the Urdu language, there have been many examples in which people use someone's work without reference or hide someone's work under their name. To improve the quality of research, it is necessary to discourage this unethical trend and try to put hurdles in this way. It is also necessary to educate researchers about ethics of research.

Keywords:
Research ethics,Plagiarism, Credit, Reference, Counterfeit, Paraphrasing, Examples

سرقہ اور جعل سازی ہر قوم، تہذیب، معاشرے، زبان اور ہر شعبۂ علم میں قابل جرم سمجھی جاتی رہی ہے۔ علم کی دنیا میں یہ اب بھی جرم ہے اور جرم ہی رہے گی۔ سرقہ اور جعل سازی، زندگی اور علم کے تمام شعبوں میں سرایت کیے رکھتی ہے البتہ جن قوموں کو جھوٹ بولنے کی عادت نہ ہو اور اخلاقی طور پر بلند معیار کے حامل ہوں تو وہاں اس کا تناسب کم ہو سکتا ہے۔ جن قوموں کے ہاں سرقہ اور جعل سازی کا تناسب کم ہوتا ہے وہ محض اپنے لوگوں کی اخلاقیات پر بھروسا کر کے بیٹھ نہیں جاتیں بلکہ ممکنہ قواعد و قوانین کے نفاذ اور اطلاق پر بھی سختی سے کاربند رہتی ہیں۔ اس کے برعکس جس معاشرے میں اخلاقی پستی اپنی انتہاؤں کو چھولے وہاں قوانین کا اطلاق بھی کوئی بند نہیں باندھ سکتا بلکہ سارے قاعدے قانون خود موم کی ناک بن جاتے ہیں۔ نسلوں کی جہالت جس شخص کی پشت پر پہاڑ بن کے کھڑی ہو اور اسے اپنے سائے اور حصار میں لیے ہو؛ جعل سازی، دھوکا دہی اور ناانصافی اس کی فطرت ثانیہ بن جاتی ہے جو اس کے لیے عارضی عزت اور ازلی ذلت کا فرق ختم کر دیتی ہے۔ ایسی صورت حال میں اعلیٰ تعلیم بھی ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔

زندگی اور علم و تعلیم کے بعض دیگر شعبوں کی طرح اردو ادب میں بھی فی زمانہ سرقہ اور جعل سازی کی بڑی پختہ روایت موجود رہی ہے جو خصوصاً جامعات میں اب ترقی یافتہ صورت اختیار کر کے ایک دبستان بن چکی ہے۔ ہمارے کلاسیکی شعرا بے چارے تو، توارد پر تڑپ جاتے تھے اور سیخ پا ہو جایا کرتے تھے۔ ان کی روحیں آج اگر اپنے جسموں میں موجود ہوتیں اور ہماری جامعاتی تحقیق کے مناظر دیکھتیں تو پانی نہ مانگتیں۔ اردو ادب کے اس پھلتے پھولتے دبستان کی تاریخ، تکنیک اور روایت پر سیر حاصل مطالعے ہوئے ہیں اور ہوتے رہیں گے کیونکہ اس دبستان کی جڑیں انسانی فطرت تک اتری ہوئی ہیں۔ بعض لوگوں کی مٹی کا خمیر ہی جعل سازی، دھوکا دہی اور فریب کاری سے اٹھایا گیا ہوتا ہے جو اگلی نسلوں تک بھی منتقل ہوتا رہتا ہے۔ سندھ یونیورسٹی جامشورو کے مجلہ "تحقیق"(۱) جامعہ کراچی کے "جریدہ"(۲) اور سہ ماہی "اثبات (سرقہ نمبر)(۳) کے علاوہ ڈاکٹر نذر خلیق نے بھی پی ایچ ڈی کے لیے اسے موضوع بنایا ہوا ہے اور مثالوں کے انبار بھی لگائے ہیں۔ ان سارے ماخذ سے اردو ادب میں سرقہ اور جعل سازی کی ہر ادا پر داد تحقیق مل جاتی ہے لیکن دھوکے بازوں اور فریب کاروں کی طرح جعل ساز بھی نت نئے طریقے اور حربے اختیار کرتے ہیں۔ سرقہ، چربہ، نقل، چوری اور جعل سازی کے سارے طریقوں اور حربوں میں مشترک اور بنیادی بات یہی ہوتی ہے کہ کسی دوسرے کی محنت پر ڈاکا ڈالا جاتا ہے اور اسے اپنے نام سے پیش کر کے کریڈٹ لینے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ایسی علمی بددیانتی اور بداخلاقی کی

جتنی مذمت کی جائے کم ہے۔ اس سلسلے کے جو معروف طریقے اور حربے جامعاتی تحقیق اور غیر سندی و انفرادی تحقیق میں ان دنوں ظہور ہو رہے ہیں ذیل میں اُن کی چند معروف، مروج اور قابل مذمت صورتوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

سرقہ (Plagiarism)

اردو ادب میں تخلیقی، تنقیدی، تحقیقی اور ترجمے کی ذیل کی کتب اور مضامین میں سرقے، نقل یا چربے کی بڑی پختہ روایت موجود ہے۔ اس کی واضح طور پر ذیل کی صورتیں عام ہیں۔ جن میں اعتراف علمی کے طور پر کسی کا حوالہ دینے کا تکلف بھی نہیں کیا جاتا۔ سرقے اور چربے کے ایسے حربوں میں مجرم سارقوں کی درجہ بندی بھی ہوتی ہے کہ کسی جاہل مطلق کی علمی حالت اتنی پتلی ہوتی ہے کہ عنوان بھی ڈھنگ سے نہیں بدل سکتا۔ کسی کو کچھ الفاظ بدلنے کی توفیق ہو جاتی ہے اور کوئی چوری سے بچنے کے لیے کچھ اپنی تعبیرات کو بھی شامل کر لینے کا اہل ہوتا ہے لیکن علمیت کا تاج پہننے کے لیے سرقے یا چربے کا محتاج ہوتا ہے۔

۱. ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی شخص پوری کتاب یا پورا مضمون کسی دوسرے کا تحریر کردہ اور شائع شدہ محض عنوان بدل کر اپنے نام سے چھپوا لیتا ہے۔
۲. کسی دوسرے کی مطبوعہ تصنیف یا مضمون کے مختلف اجزا کو ٹکڑوں میں من و عن اپنی تالیف لطیف کی زینت بنا لیا جاتا ہے۔
۳. کسی دوسرے کی مطبوعہ تصنیف یا مضمون کو کچھ الفاظ یا جملے بدل کر اپنے نام سے پیش کر لیا جاتا ہے۔
۴. ایسے مکار سارق بھی ہوتے ہیں جو کسی ایک کی بجائے مختلف ماخذ سے من و عن عبارتیں نقل کر کے جوڑ لیتے ہیں تا کہ پکڑے نہ جائیں یا فوری نہ پکڑے جائیں۔
۵. اردو میں انگریزی کتب سے سرقے اور چربے کی مکمل یا جزوی مثالیں بھی بہت مل جاتی ہیں۔ اسی طرح اردو اور مقامی پاکستانی زبانوں کے باہم سرقوں کے امکانات بھی روشن ہیں۔
۶. سرقے اور چربے کے ایسے تمام حربے قابل مذمت اور جرم ہیں جو ایک اچھے اور اعلیٰ انسان اور محقق کو زیب نہیں دیتے۔

جعل سازی

اردو تحقیق کی روایت میں سرقے، چربے، نقل اور چوری کے علاوہ جعل سازی کے اور بہت سے مختلف اور شرمناک طریقے رائج ہیں جو سرقے یا چربے اور چوری سے کم جرم نہیں ہیں بلکہ جعل سازوں کی بد دیانتی، بد اخلاقی، ڈھٹائی، دیدہ دلیری، چوری اور سینہ زوری سے عبارت ہیں۔ سرقہ یا چربہ تو ایسا جرم ہے جو چپکے سے کر لیا جاتا ہے اور اس فہرست میں ایسے پختہ کار ادیب اور مصنف بھی آجاتے ہیں جن کی علمیت پر شک نہیں ہوتا البتہ کچھ کمزور لمحے انہیں بے راہ کر دیتے ہیں اور وہ حوالہ دینے کی اخلاقی جرات سے محروم ہو جاتے ہیں حالانکہ ان کی علمیت سرقے یا چربے کی محتاج نہیں ہوتی لیکن جعل سازی میں تو اکثر ڈنکے کی چوٹ پر جرم کیا جارہا ہوتا ہے۔ اصل مصنف کا اعتراف بھی کیا جارہا ہوتا ہے اور حوالہ بھی دیا جارہا ہوتا ہے لیکن جعل سازی، دھوکا دہی اور فریب کاری سے کسی دوسرے کے علم کو اپنا بنا کر پیش کرتے ہوئے اپنا قد بھی اونچا کیا جارہا ہوتا ہے۔ یہ چلن سندی تحقیق میں زیادہ در آیا ہے لیکن انفرادی اور غیر سندی تحقیق میں بھی اس کی پرانی روایت موجود ہے۔ جعل سازی کے ایسے معروف اور مروج حربے جو جرم کی ذیل میں آتے ہیں اور قابل مذمت سمجھے جانے چاہیں، ذیل میں ملاحظہ کیجیے:۔

ا۔ کسی ایک موضوع پر ایک یا ایک سے زیادہ اشخاص کے افکار و نظریات پر بحث کرتے ہوئے یا ان کی تائید و تردید کرنے کے لیے ان کے طویل مباحث کو اپنے الفاظ میں تلخیص کر کے پیش کیا جاتا ہے اور ساتھ ہی حوالہ دے دیا جاتا ہے یعنی واوین میں ان کی تحریر سے اقتباس دینے کی بجائے ان کے دلائل یا ان کی آرا کا ملخص اپنے الفاظ میں درج کیا جاتا ہے۔ اس صورت میں ان کا یا ان کی کتاب کا نام درج کر کے یا ان کے نظریات کا مختصر ترین خلاصہ کر کے اس کے بعد حوالہ دیا جاتا ہے کہ فلاں نے یہ کہنا چاہا ہے۔ یہ صورت تب پیدا ہوتی ہے کہ جب حوالہ دیے جانے والے مصنف کی تحریر میں وہ بحث بہت طویل ہو اور اس میں سے ایک آدھ پیراگراف کو واوین میں اقتباس دینے سے اس بحث کا احاطہ کیا جانا ممکن نہ ہو تو حوالہ نگاری کا یہ طریقہ اختیار کیا جاتا ہے جسے Paraphrasing یا ملخص حوالہ کہا جاتا ہے۔

حوالے کے اس طریقے کی دوسری ضرورت تب ہوتی ہے جب ایک ہی موضوع پر ایک جیسی رائے رکھنے والے زیادہ مصنفین کی طرف اشارہ کرنا ہو تو ان کے نام لکھ کر اور ہر نام پر حوالہ دے کر ان کے نقطۂ نظر

کو تفصیل سے ملاحظہ کرنے کے لیے حوالے دے دیے جاتے ہیں تا کہ غیر ضروری اقتباسات کو درج کرنے سے بچا جا سکے۔ حوالہ نگاری کے اس طریقے کا بنیادی مقصد یہی ہوتا ہے کہ تحقیق میں رطب و یابس اور بے جا پھیلاو سے بچا جا سکے۔ اس طرح تحریر میں جامعیت اور اختصار پیدا ہوتا ہے جس سے معیار تحقیق بھی بلند ہوتا ہے۔

ملخص حوالہ (Paraphrasing) کا طریقہ علمی دنیا کے سب شعبوں میں اختیار کیا جاتا ہے اور اسے قدر کی نگاہ سے بھی دیکھا جاتا ہے لیکن یہ ان معاشروں میں قابل قبول ہے جو جھوٹ، ریاکاری، جعل سازی اور منافقت سے دور ہیں اور ذمہ داری سے حق بات کہنا اور لکھنا جن کا شیوہ ہے۔ جس معاشرے میں جعل سازی کے سارے حربے اپنائے جاتے ہوں اور جھوٹ، منافقت اور ریاکاری جہاں عام ہو وہاں Paraphrasing جیسے حوالے کے طریقے کو اختیار کر کے جعل سازی کے فروغ کے ساتھ علمی حوالے سے ناقابل تلافی نقصانات کا بھی اندیشہ ہوتا ہے۔ کہنے اور لکھنے والے نے کچھ اور کہا اور لکھا ہو لیکن اس کے بیان کو تلخیص کرنے والے سہواً یا جان بوجھ کر اپنے مفاد اور مقاصد کے لیے کچھ کا کچھ بنا دیں۔

اس سے ہٹ کر بھی ہمارے ہاں اردو تحقیق و تنقید میں اس کے مختلف مظاہرے ملتے ہیں۔ مثلاً کسی کے نقطۂ نظر کی تلخیص دینے کی بجائے پورے صفحے کے متن کے طور پر کئی کئی صفحات من و عن نقل کیے جاتے ہیں اور اختتام پر حوالہ دیے دیا جاتا ہے۔ اور یہ طریقہ پوری کتاب یا مقالے میں اختیار کیا گیا ہوتا ہے۔ بعض اوقات مصنف یا مقالہ نگار اسے اپنی عبارت اور تحریر کے طور پر بھی پیش کر جاتے ہیں۔ یہ تو کوئی اصل حوالے سے موازنہ کرنے پر جان سکتا ہے کہ تلخیص دی ہے یا پورا متن من و عن نقل کیا ہے۔ جبکہ اسکالر موصوف تلخیص دینے کا کریڈٹ لے رہا ہوتا ہے اور دعوی کر رہا ہوتا ہے کہ میں نے عام لوگوں کی طرح اپنی تحقیق کو اقتباسات کی کھتونی نہیں بنایا۔ اصل حقیقت تو موازنے ہی سے سامنے آتی ہے۔ حوالہ نگاری کے اس عالمانہ طریق کار میں چونکہ یہ رعایت موجود ہے کہ جعل سازی کی راہ ہموار ہو سکتی ہے۔ اس لیے ہمارے ہاں اس کا چلن سندی مقالات میں خصوصاً عام ہوتا جا رہا ہے۔ جامعات کے نگران اساتذہ کے لیے یہ ایک آزمائش ہے۔ انہیں چاہیے کہ خصوصاً نو آموز اسکالرز کی اس طرح حوالہ دینے کی حوصلہ شکنی کریں یا پھر اس پہلو پر خوب نظر رکھیں۔

۲. بعض سندی مقالات میں جعل سازی کا یہ رجحان بھی دیکھنے کو ملتا ہے کہ مقالہ نگار اپنے موضوع سے متعلق کسی کتاب یا مضمون کو من و عن اس طرح نقل کرنا شروع کرتے ہیں کہ پورے صفحے کے سائز میں متن کمپوز کیا جا رہا ہوتا ہے۔ کمپوزنگ کے اس انداز کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ عبارت مقالہ نگار کا نتیجۂ قلم ہے۔ اس طرح نقل کیے جانے والے متن میں سے آگے چل کر وقفے وقفے سے کوئی پیراگراف واوین میں اقتباس کے انداز میں حاشیے چھوڑ کر بھی دے دیا جاتا ہے اور اس پر حوالہ بھی ٹانک دیا جاتا ہے۔ گویا یہ تاثر دینے کی کوشش کی جا رہی ہوتی ہے کہ مقالہ ہم خود ہی لکھ رہے ہیں اور تحقیقی استناد کے لیے اقتباسات اور حوالے بھی دے رہے ہیں جبکہ اصل میں وہ سارا کچھ کسی ایک یا مختلف کتب اور مضامین میں سے مسلسل نقل کیا گیا ہوتا ہے۔

ایسی جعل سازی کے مرتکب دو طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ بعض نیم پخت ایک دو کتابیں سامنے رکھ کے اس طریقے سے کارِ تحقیق انجام دے رہے ہوتے ہیں اور بعض مکار اور چالاک ماخذ بدل بدل کر، پیراگراف اوپر نیچے کر کے اور پیراگرافوں کے شروع اور آخر کے جملے حذف کر کے یا بدل کے نقل کرتے جاتے ہیں تاکہ گرفت میں نہ آسکیں۔ اس مکاری سے کارِ تحقیق انجام دینے والے کچھ خاص تربیت یافتہ مقالہ نگار خود بھی ہوتے ہیں لیکن عموماً یہ کارروائی اجرتی اور پیشہ ور لوگوں کی ہوتی ہے جو مقالہ نگار سے طے شدہ فیس بھی وصول کر لیتے ہیں اور پھر بھی ایمانداری کا مظاہرہ نہیں کر سکتے۔ شاید وہ بدقسمت مقالہ نگار منہ مانگی فیس میں بڑی رعایت کروالیتا ہے تو اس لیے اس کے ساتھ یہ سلوک ہوتا ہے۔

۳. جعل سازی کا ایک طریقہ Self-plagiarism ہے یعنی پہلے سے مطبوعہ اپنی کتاب یا تحریر کو نام بدل کر اور ایک آدھ جگہ کچھ حذف و اضافہ کر کے یا معمولی حذف و اضافہ بھی کیے بغیر دوبارہ شائع کروالیا جائے۔ یہاں یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ کسی مصنف کی اپنی تحریر اس کی ملکیت ہے وہ اسے جتنی بار اور جہاں چاہے چھپوائے مگر اخلاقیاتِ تحقیق کا تقاضا ہے کہ وہ اگر اپنی کسی تصنیف یا تحریر میں ترمیم و اضافہ یا حذف و اضافہ کر کے چھپواتا ہے تو اسے کوشش کرنی چاہیے عنوان تبدیل نہ کرے دوسرا شروع میں وضاحت کر دے کہ یہ میری پرانی مطبوعہ تحریر ہے۔ جس پر نظرِ ثانی کر کے دوبارہ پیش کیا جا رہا ہے۔ ایسی وضاحت نہ کی جائے تو یہ self-plagiarism کی ذیل میں آتا ہے۔ اردو کے افسانوی ادب اور تنقید میں اس کی مثالیں زیادہ ملتی ہیں کہ بعض

مصنفین، مدیروں یا پبلشروں کے تقاضوں کے پیش نظر یا اپنی فہرست کتب و مضامین طویل کرنے کے پھیر میں ایسے کمزور لمحوں کی زد میں آجاتے ہیں۔

اس کے علاوہ جامعات میں پی ایچ ڈی کی ڈگری کی اہمیت بڑھنے پر تقریباً اس اکیسویں صدی کے آغاز میں جامعاتی تحقیق میں self-plagiarism کا رجحان دکھائی دیا کہ پی ایچ ڈی کی ضرورت کے پیش نظر ایسا موضوع لے لیا جاتا تھا جس پر پہلے ہی مقالہ نگار کے کچھ نہ کچھ مضامین شائع ہو چکے ہوتے تھے۔ اس صورت میں وہ اپنے ان مطبوعہ مضامین کو اپنے مقالے میں من و عن شامل کر لیتا تھا۔ بعض سمجھ دار لوگ اپنے ایم اے یا ایم فل کے موضوعات ہی کی توسیع کر کے یا کچھ عنوان میں ردوبدل کر کے پی ایچ ڈی کا موضوع منظور کروا لیتے تھے اور پھر اپنے سابقہ تحقیقی مقالات جن پر کوئی نہ کوئی ڈگری لے چکے ہوتے ان کی نوک پلک سنوار کے پورے مقالے کو پی ایچ ڈی کے مقالے میں شامل کر لیتے اور ایچ ای سی کی ہدایت پر مقالے کے شروع میں "اقرار نامہ" کے عنوان سے بیان حلفی بھی لکھ دیتے کہ میں نے اس مقالے میں پیش کیا جانے والا مواد پہلے کسی ڈگری کے لیے پیش یا طبع نہیں کیا۔ ڈھٹائی یہی ہوتی ہے کہ یہ تو ہمارا اپنا سرمایہ ہے لیکن یہ بھی باقاعدہ جرم اور قابل مذمت ہے۔ جامعات میں ہونے والے مقالات کی فہرستیں دیکھیں تو بعض مقالہ نگاروں کے دونوں یا تینوں ڈگریوں کے موضوعات دیکھ کر بہت روشنی ملتی ہے۔ کوئی اس کا کارِ تحقیق کا مشاہدہ کرنا چاہے اور مطلوبہ مقالات ان کی رسائی میں نہ آتے ہوں تو ایسے مقالہ نگاروں سے گزارش کر کے ان کی ذاتی کاپیاں طلب کی جا سکتی ہیں وہ ذاتی کاپی عنایت کریں یا نہ کریں دونوں صورتوں میں حقیقتِ حال واضح ہو جائے گی۔

اپنی مطبوعہ یا غیر مطبوعہ اور ڈگری یافتہ تحقیق کو پی ایچ ڈی کے مقالے کا حصہ بنانے کا رجحان اب تقریباً ختم ہو رہا ہے کیونکہ ایچ ای سی کے طفیل جامعات میں تحقیقی سرگرمیاں بڑھنے کے ساتھ ہی جن لوگوں نے مجبوری یا شوق سے پی ایچ ڈی کی ضرورت و اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے کام کا آغاز کیا لکھنے پڑھنے کے حوالے سے ان کی بنیادیں قدرے مضبوط تھیں اور اس سے پہلے وہ کچھ نہ کچھ لکھتے اور چھپتے رہتے تھے۔ اب صورت حال مختلف ہے اب تو اکثر اسکالرز کا پی ایچ ڈی کے وائیوے تک صرف ایک مضمون پہلی بار شائع ہو پاتا ہے وہ بھی اس لیے کہ وائیوے کی شرط ہے ورنہ اس سے پہلے ان کے پاس ایسا کوئی مطبوعہ سرمایہ ہوتا ہی نہیں

جسے وہ پی ایچ ڈی کے مقالے کا حصہ بنا سکیں۔ البتہ ایم فل کے موضوع کو توسیع دے کر پی ایچ ڈی کے مقالے میں اسے شامل کر لینے کے امکانات کو رد نہیں کیا جا سکتا۔ ان پہلوؤں پر بھی نگران اساتذہ کی اور ممتحنین کی نظر رہنی چاہیے۔

۴. جعل سازی کی ایک اور صورت اجرتی تحقیق ہے یعنی کسی کو پیسے ادا کر کے کوئی تصنیف، مقالہ یا مضمون لکھوا لینا اور اپنے نام سے شائع کروا لینا یا پیش کر دینا۔ یہ طریقہ نیا نہیں ہے اگلے وقتوں کے لوگ بھی اس طرح کے کاروبار کر لیا کرتے تھے۔ تخلیق، تنقید، تحقیق اور ترجمہ سب شعبوں میں ہر زمانے میں یہ لین دین ہوتا رہا ہے۔ بعض شاعر، ادیب، نقاد، محقق بے چارے غم روزگار کے سبب اپنی اولاد معنوی بیچنے پہ مجبور رہے۔ مولانا محمد حسین آزاد (۴) نے غربت کی وجہ سے مصحفی کا غزلیں بیچنا اور پھر مشاعروں میں ہلکے شعروں پر داد نہ ملنے کا تذکرہ کیا ہے۔ اقبال ساجد (۵) اور ساغر صدیقی جیسے شعرا کی مثالیں بھی سامنے کی ہیں۔

حالات سے مجبور کوئی شخص اپنا پیٹ پالنے کے لیے اگر اپنے علم و فن کو فروخت کرتا ہے تو یہ جرم نہیں اس کی مجبوری ہے۔ مجرم وہ ہے جو اس کی مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کے علم و فن کو خرید کر اپنے نام سے شائع یا پیش کرتا ہے اور اس چیز کا کریڈٹ لیتا ہے جس کا وہ خود اہل نہیں۔ ایسی خریداری عموماً وہ لوگ کرتے ہیں جن کا خود علم و ادب سے براہ راست تعلق نہیں ہوتا اور زندگی کے دوسرے محاذوں پر کام کر رہے ہوتے ہیں۔ علم و ادب کے علاوہ اپنے مقاصد اور مناصب میں وہ کامیاب ہو جائیں تو تفریح اور شہرت کے لیے یہ خریداری شروع کر لیتے ہیں اور اگر ناکام ہو جائیں تو بھی اس میدان میں سہولت سمجھتے ہیں کہ جعل سازی سے یہاں اپنی جگہ بنائی جا سکتی ہے۔ علم و ادب اور فنون لطیفہ سے ان کا تعلق اتنا ہی ہوتا ہے جیسا نوعمری میں ہر شخص کو ہوتا ہے۔ اس معمولی سی بنیاد پر اپنی دولت کی مدد سے وہ عالم فاضل اور ماہر فن کے اعزازات حاصل کر لیتے ہیں اور معاشرے کے عام چلن کے مطابق ان کو قبول بھی کر لیا جاتا ہے۔

جامعات میں خصوصاً سندی تحقیق کے لیے ایسی جعل سازی کا ایک طوفان آیا ہوا ہے جو شاید ہمارا کلچر ہی بنتا چلا جا رہا ہے۔ ایسے اجرتی اور پیشہ ور لوگوں نے تحقیقی رہنمائی کے نام پر باقاعدہ ادارے بنا لیے جہاں یہ کاروبار اپنے عروج پر ہے۔ سوشل میڈیا کے ذریعے ایسی تحقیقی رہنمائی کی تشہیر بھی کی جا رہی ہے اور معاوضے

بھی طے ہو رہے ہیں۔ اب جعل ساز اور نا اہل جامعاتی اسکالرز کو نہ موضوع کے انتخاب کی پریشانی ہے؛نہ اس موضوع پر مواد ڈھونڈنے اور جمع کرنے کی ضرورت ہے؛نہ پڑھنے اور نوٹس لینے کی فکر اور نہ مقالہ لکھنے کا دردِ سر رہا۔ بس معاوضہ طے کیجیے اور ڈگری وصول کرنے کے اہل ہو جائیے۔ اس طرح کارِ تحقیق انجام دینے والے اور تحقیق اور تحقیق کاروں کی خدمت اور رہنمائی کرنے والے افراد یا ان کے بنائے ہوئے ادارے کچھ اور سہولیات بھی دیتے ہیں۔ آپ چاہیں تو موضوع کا انتخاب سے لے کر مقالہ جمع کروانے کے لیے تیار کرنے تک تمام تحقیقی مراحل اور مدارج کا مجموعی معاوضہ طے کر کے ادا کر دیجیے اور مقالہ حاصل کر لیجیے اور اگر چاہیں تو کسی ایک مشکل مرحلے سے گزرنے کی قیمت ادا کر دیجیے اور باقی دردِ سر اپنے سرے لے لیجیے۔ اگر اس دردِ سر کا علاج آپ سے ممکن نہ ہو سکے تو پھر رجوع کرنے کی سہولت موجود ہے پھر اس مرحلے سے گزرنے کا معاوضہ دیجیے اور آرام سے سو جائیے۔

اجرتی تحقیق کاروں نے اس کارِ تحقیق کو بالکل مارکیٹ کے انداز میں شروع کیا ہوا ہے۔ مارکیٹ میں اشیائے ضروریات کی قیمتیں جس طرح ان کی کوالٹی کی بنیاد پر وصول کی جاتی ہیں بالکل اس طرح تحقیقی مقالات کے معیار کے لحاظ سے معاوضہ طے ہوتا ہے۔ آپ نے اعلی درجے کا معیاری تحقیقی مقالہ لکھوانا ہے یا بس گزارے کا، اس حساب سے اس کا معاوضہ طے کیا جاتا ہے۔ بعض کار گزار ایسا غیر معیاری مقالہ تیار کر کے فروخت کرتے ہیں کہ اگر کوئی ممتحن ذرا سی توجہ کر لے تو مقالہ نگار گرفت میں آ جاتا ہے کیونکہ مقالہ نگار کے منت سماجت کرنے یا کسی سفارشی کے ذریعے معاوضہ بہت کم کروا لینے کی وجہ سے کار گزار بھی اتنا دردِ سر مول نہیں لیتا اور کم یا زیادہ معاوضہ لینے کے باوجود بد دیانتی اور جعل سازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے نقل اور سرقے جیسے حربے اختیار کر کے مقالہ تیار کرتا ہے۔ اس طرح کے ایک شکوہ کناں مقالہ نگار کی کہانی تو ڈاکٹر انور سدید(٦) نے بھی بیان کی ہوئی ہے۔ اس طرح کے کچھ شکوہ کناں مقالہ نگار ہمارے مشاہدے میں بھی آئے ہیں۔ ان کی تحقیق کی نگرانی کرتے ہوئے یا وائیوا لیتے ہوئے ایسے عبرت ناک حقائق سامنے آتے رہتے ہیں۔

٥. تحقیق و تدوین کے نام پر کچھ ایسے کام بھی ہوئے ہیں اور ہو رہے ہیں جو سرقے کی ذیل میں تو نہیں آتے البتہ چربے اور جعل سازی کے زمرے میں آتے ہیں اور اس میں بھی انوکھے اور منفرد ڈھنگ کے حامل ہیں۔ یوں تو

سرقہ اور چربہ، چوری اور جعل سازی قرار پاتے ہیں لیکن اگر کوئی شخص چوری اور سینہ زوری، ڈھٹائی اور دیدہ دلیری کا مظاہرہ کرتے ہوئے سرقہ اور چربہ بھی چوری چھپے کرنے کی بجائے اعلانیہ اور ڈنکے کی چوٹ پر کرے تو اسے جعل سازی کا ایک انوکھا حربہ قرار دینا پڑتا ہے کیونکہ اس کا بھی بنیادی مقصد غلط کریڈٹ لینا ہی ہے۔

تحقیق و تدوین میں ایسے کچھ کام غالب اور اقبال کے حوالے سے بھی ہوئے ہیں اور کچھ کلاسیکی ادب کے قلمی مخطوطات خصوصاً غیر مطبوعہ تذکروں کو مرتب کرنے کے حوالے سے بھی ہوئے ہیں کہ ایک ہی نسخے کو ایک سے زیادہ لوگ باری باری مرتب کرتے ہیں۔ پہلے مرتب پر جب دوسرا مرتب کوئی اضافہ نہیں کر سکتا تو محنت، وقت اور پیسے کے اصراف کی کیا ضرورت ہے۔ اگر آپ کو کچھ اختلافات ہیں تو ایک آدھ مضمون میں اس کا اظہار کر لیجیے۔ ایسی جعل سازی کی ایک مثال پیش خدمت ہے: ڈاکٹر مظہر احمد نے یوسف خاں کمبل پوش کا ایک سفر نامہ "سیر ملک اودھ" کے نام سے مرتب کیا جو دہلی سے ۲۰۱۹ء میں شائع ہوا ہے۔ جس کے سرورق پر مرتب کے نام سے پہلے صرف "مقدمہ حواشی فرہنگ" کے الفاظ درج ہیں۔ البتہ کتاب کے کوائف میں "مرتب" کے طور پر ڈاکٹر مظہر احمد درج ہے۔ ان سے پہلے یہی سفر نامہ مکمل آداب تدوین کے مطابق پاکستان سے ڈاکٹر نجیبہ عارف مدون کر چکی ہیں جو پہلے رسالہ "بنیاد" (۷) میں ۲۰۱۵ء میں شائع ہوا بعد میں نظر ثانی اور ترمیم و اضافہ کے ساتھ کتابی صورت میں ۲۰۱۷ء میں پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی، لاہور سے شائع ہوا۔ ڈاکٹر مظہر احمد، کمبل پوش کے اس سفر نامے کے بارے میں اس سے پہلے مکمل بے خبر تھے حالانکہ وہ "عجائبات فرنگ" پر اس سے پہلے ہاتھ صاف کر چکے تھے اور ایک طرح سے کمبل پوش ان کا موضوع تو بنا ہوا تھا۔ ڈاکٹر مظہر احمد کئی سال سے پریشان تھے کہ کمبل پوش نے "عجائبات فرنگ" کے علاوہ کوئی اور سفر نامہ کیوں نہیں لکھا۔ دیکھیے اس دوسرے سفر نامے کی دریافت کا سن کر انھیں کس قدر خوش آئند حیرت ہوئی۔ وہ لکھتے ہیں:

> "اور پھر اچانک ایک دن فون کی گھنٹی بجی۔ ہمارے ایک دوست نے ہمیں یہ مژدہ سنایا کہ کمبل پوش کا دوسرا سفر نامہ دستیاب ہو گیا ہے اور اسے پاکستان کی ایک ادیبہ محترمہ نجیبہ عارف نے ایک رسالے میں شائع بھی کر دیا ہے۔ یہ اطلاع خوش آئند بھی تھی اور حیرت انگیز بھی۔" (۸)

گویا وہ ۲۰۱۵ء سے پہلے اس دوسرے سفر نامے کے بارے میں بے خبر تھے۔ ڈاکٹر مظہر احمد ذرا آگے چل کر ڈاکٹر نجیبہ عارف کی اس تحقیق و تدوین کا اعتراف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> "اس حیرت انگیز مگر خوشگوار انکشاف کے بعد محترمہ نے نہایت خشوع و خضوع اور جانفشانی سے اس مخطوطے کی تدوین کی۔ جیسا کہ انہوں نے فرمایا کہ نسخہ بوسیدہ اور کرم خوردہ تھا۔ جس کی تصدیق ہمیں کتاب کی اشاعت کے بعد اس کے عکس سے بھی ہوتی ہے۔ اسے صاف کرنا اس کی قراءت کرنا اور جدید املا کے تحت اسے رقم کرنا، جوئے شیر لانے جیسا ہے اور ہمیں محترمہ نجیبہ عارف کی اس محنت اور دّقت پسندی کی داد دینی چاہیے کہ انہوں نے کمبل پوش کے اس نو دریافت شدہ سفر نامے پر کئی سال صرف کیے اور اس کا قدرے ایک بیشتر (کذا) اور جدید ایڈیشن شائع کیا۔ (۹)

اس کے باوجود ڈاکٹر مظہر احمد اس سفر نامے کی دوبارہ تدوین کرنے کا جواز فراہم کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> "اس کتاب کے سرسری مطالعے سے اندازہ ہوا کہ موصوفہ سے کہیں کہیں قراءت میں کوتاہی ہوئی ہے۔ جس کی وجہ سے نفس مضمون اور مطالب گنجلک ہو گئے ہیں۔ نیز حواشی میں بھی ایک آدھ جگہ غلطی سرزد ہو گئی ہے۔ آج کے کم سواد قارئین کے مطابق فرہنگ میں بھی اضافہ کی گنجائش نظر آئی۔ چنانچہ طے کیا کہ ایک ہندوستانی ایڈیشن تیار کیا جائے جس میں محترمہ نجیبہ عارف کی تدوینی کاوشوں کی داد دیتے ہوئے نہایت ادب کے ساتھ ان کی چند کوتاہیوں کی طرف بھی اشارے کیے جائیں۔"(۱۰)

گویا ڈاکٹر نجیبہ عارف کی تحقیق و تدوین کی "چند کوتاہیوں" کی اصلاح کے لیے ڈاکٹر مظہر احمد کو دوبارہ اس سفر نامے کی تدوین کرنا پڑی۔ آگے بڑھنے سے پہلے ڈاکٹر صاحب کے مندرجہ بالا اقتباس کو دوبارہ دیکھتے ہیں کہ کن کوتاہیوں کی کس طرح اصلاح کا انھوں نے بیڑہ اٹھایا ہے۔

۱۔ قرأت میں کوتاہی سے مطالب گنجلک ہو گئے تھے۔
۲۔ حواشی میں ایک آدھ غلطی تھی۔
۳۔ کم سواد یا کم علم قاری کے لیے فرہنگ میں اضافے کی ضرورت تھی۔

تدوین میں سب سے اہم کام متن کی صحیح قرأت اور منشائے مصنف کے مطابق متن کی تدوین کرنا ہوتا ہے۔ ڈاکٹر نجیبہ عارف کی قرأت میں انھیں "کہیں کہیں کوتاہیاں" نظر آئیں اور انھوں نے اسے از سر نو مرتب کرنے کا ارادہ کیا لیکن کیا کیا۔ ڈاکٹر مظہر احمد موصوف کے مطابق ڈاکٹر نجیبہ عارف نے اپنے مرتبہ سفر نامے میں قلمی نسخے کا عکس بھی شامل کیا ہے "مگر ایک صفحے پر چار اوراق کا عکس قابل قرأت نہیں ہے۔"(۱۱) یعنی ایک تو ڈاکٹر نجیبہ عارف کا دیا گیا قلمی نسخے کا عکس قابل قرأت نہیں دوسرا ڈاکٹر مظہر احمد موصوف نے "اس کتاب کا سرسری مطالعہ" کیا ہے اور تیسرا یہ کہ قلمی نسخے کا بہتر اور قابل قرأت عکس نہ وہ ڈاکٹر صاحبہ سے منگوا سکے اور نہ بودلئین لائبریری لندن سے منگوا سکے تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ پھر ان کو ڈاکٹر نجیبہ عارف کی قرأت میں کوتاہیاں کیسے نظر آگئیں۔ چلیے اگر آپ کو یہ یقین بھی ہو گیا ہو کہ قرأت میں کوتاہیاں ہوئی ہیں تو ظاہر ہے ایسی کوتاہیاں اصل قلمی نسخے یا اس کے قابل قرأت عکس کے بغیر تو دور نہیں ہو سکتی تھیں اور ان میں سے کوئی بھی آپ حاصل نہیں کر سکے تو پھر مرتب کو اپنا ارادہ بدل کر کسی اور کام میں مصروف ہو جانا چاہیے تھا۔ ڈاکٹر مظہر احمد کا اگلا بیان ملاحظہ کیجیے:

> "کاش یہ ممکن ہوتا کہ سفر نامے کا عکسی نسخہ ہاتھ آجاتا تو قرأت پر بھی از سر نو غور کیا جاتا مگر یہ ممکن نہ ہو سکا۔ چنانچہ طے کیا کہ محترمہ نجیبہ عارف کی قرأت پر بھروسہ کر کے اس سفر نامے کے دوسرے پہلوؤں پر کام کیا جائے۔"(۱۲)

لیجیے جس قرأت میں کوتاہیاں تھیں موصوف کو اسی قرأت پر بھروسا کرنا پڑا۔ جن دوسرے پہلوؤں پر کام کرنا طے پایا ان کا حال پہلے بیان کر دیا گیا ہے کہ "ایک آدھ" حاشیہ درست کرنا اور کم مواد قارئین کے لیے " فرہنگ میں بھی اضافے" کرنا یعنی مشکل الفاظ کے معانی کی فرہنگ تو ڈاکٹر نجیبہ عارف نے تیار کر لی تھی مگر ڈاکٹر مظہر احمد کے قارئین کو آسان الفاظ کے معانی بھی درکار تھے، سو ان کے احترام میں چونکہ ان کو فرہنگ میں اضافے کی گنجائش نظر آئی اس لیے انھوں نے اس کو از سر نو چھاپ کر خود کریڈٹ لے لیا۔ اگر ان کے پاس کرنے کے اور بہت سے اور اہم کام ہوتے تو ڈاکٹر نجیبہ عارف کی اس تدوین پر ایک تبصرہ لکھ کر چھپوا لیتے اور ان کی اجازت سے انھیں کے نام سے اس کا ہندوستانی ایڈیشن چھپوا لیتے تو بہتر تھا۔

٦. علم وادب کی بعض بلند قامت اور مقتدر شخصیات کے ہاں بھی جعل سازی جیسا منفی اور قابل مذمت رویہ دیکھنے کو مل جاتا ہے کہ اپنی علمی قامت یا عہدے اور منصب کی بنا پر دوسرے مجبور یا ماتحت اسکالرز سے تحقیقی کام کروا کے اپنے نام سے شائع کروالیتے ہیں۔ اس میں اپنے اختیارات کا ناجائز استعمال کرتے ہوئے رعب اور دھونس سے کام لینے کا رویہ بھی مشاہدہ ہوا ہے اور دھوکا دہی سے کام کروانے کے رویے بھی سامنے آئے ہیں۔ کچھ نام نہاد اسکالر جو افسر بھی ہوتے ہیں اور ان کو اپنے لیے یا اپنے شعبے کے لیے ریسرچ اسسٹنٹ رکھنے کی سہولت بھی ہوتی ہے۔ ان کے ہاں یہ رویّہ پایا جاتا ہے کہ وہ علمی کام بھی اپنے ریسرچ اسسٹنٹ سے کرواتے ہیں اور اسے شائع اپنے نام سے کرواتے ہیں۔ ایسے ریسرچ اسسٹنٹ سے تقرری کے وقت بات واضح نہیں کی جاتی۔ اسے بہت عزت و توقیر سے علمی تعاون کے لیے لیا جاتا ہے۔ اس کی مدد سے جب کوئی علمی کام مکمل ہو جاتا ہے تو وہ صرف اس نام نہاد افسر کے نام سے شائع ہوتا ہے مثلاً دلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں رشید حسن خاں کو بطور ریسرچ اسسٹنٹ لیا گیا تھا لیکن صدر شعبۂ اردو خواجہ احمد فاروقی ان سے کتب کی تدوین بھی کرواتے تھے اور شعبے کا رسالہ "اردوئے معلی" بھی مرتب کرواتے تھے لیکن یہ سب کچھ چھپتا خواجہ احمد فاروقی کے نام سے تھا۔ اسی وجہ سے ان کے آپس میں اختلافات بھی ہوئے۔ راقم (١٣) نے اپنے پی-ایچ-ڈی کے مقالے میں اس موضوع پر تفصیل سے بحث کی ہے اور مثالیں بھی دی ہیں۔ اسی طرح نیاز فتح پوری کا اپنے رسالے "نگار" کا خدا نمبر نکالنے کا معاملہ بھی متنازعہ ہے۔ اسحاق صدیقی کا بیان ہے کہ یہ پورا نمبر انھوں نے نیاز صاحب کے کہنے پر مرتب کیا ہے جس کے مرتب کرنے کا معاوضہ دینے اور اس پر بطور مرتب ان کا نام دینے کا وعدہ بھی نیاز فتح پوری نے کیا تھا لیکن اشاعت کے بعد پتا چلا کہ اس پر صرف مدیر کا نام ہے۔ غرض معاوضہ دیا نہ کریڈٹ دیا ہے۔ (١٤)

٧. اپنی علمی قامت اور عہدے یا منصب کے طفیل دوسروں کی علمی کاوشوں کو اپنے کھاتے میں ڈالنے کی ایک دوسری صورت جامعاتی تحقیق میں فروغ پانے کو ہے جو قابلِ مذمت ہے۔ مقالہ لکھنے والے طالب علموں کو وائیوے سے پہلے تک اپنا ایک مضمون ضرور شائع کروانا پڑتا ہے۔ ایسے مضامین میں تحقیق و تجزیات کا معیار بھی بہتر نہیں ہوتا اور مقالہ نگار بھی رسم وراہ والے نہیں ہوتے؛ دوسری طرف ایچ-ای-سی کے منظور شدہ تحقیقی رسائل میں شائع ہونے والے اساتذہ اور اسکالرز کی بھی ایک لمبی قطار ہوتی ہے سو مقالہ نگار کو اپنا مضمون

چھپوانے میں بہت مشکل ہوتی ہے۔ اس مشکل کشائی کے لیے پھر اس کے نگران محترم کو دردِ سر لینا پڑ تا ہے۔ اس طرح اسکالر کے نگران کار کی دستگیری سے اس کا مقالہ شائع ہو جاتا ہے مگر بطور مصنف نگران کا نام پہلے درج ہوتا ہے یعنی مقالہ نگار کو معاون مصنف (Co-Author) بننا پڑ تا ہے۔ اس کی اخلاقیات مرتب کرنے اور ان پر عمل پیرا ہونے کی ضرورت ہے کہ کسی کی مجبوری سے علمی فائدہ حاصل کرنا تو اخلاقی جرم ہی سمجھا جانا چاہیے۔ شائع ہونے والے ایسے مضامین اگر ڈگری کے لیے لکھے جانے والے کسی اسکالر کے مقالے کا حصہ ہوں تو نگران کار کو اس مضمون کے مصنف کا کریڈٹ قطعاً نہیں لینا چاہیے۔ مقالہ نگار اپنا مضمون چھپوانے کی مجبوری یا شوق میں چاہے خود بھی اس پر راضی ہو لیکن نگرانِ کار کو اخلاقاً خود کو معاون مصنف ہی کے طور پر رکھنا چاہیے۔ کسی ڈگری کے علاوہ اگر ایک سے زیادہ لوگ مل کر کوئی تحقیقی مضمون لکھیں تو یہ ان پر منحصر ہے کہ اپنے اپنے کام اور محنت کے حساب سے اپنی درجہ بندی کر لیں البتہ غلط نوازی یہاں بھی نہیں ہونی چاہیے۔

۸. اگر کسی شخص کو اپنے آباواجداد، اساتذہ یا دوستوں کا کسی طرح کا علمی و ادبی اور تصنیفی سرمایا ہاتھ آ جائے اور وہ مکمل ہو لیکن اس کے مصنف کو اسے شائع کروانے کا موقع میسر نہ آیا ہو تو اب جو اس تصنیفی سرمائے کا وارث بن بیٹھا ہو اسے قطعاً یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اسے اپنے نام سے شائع کروالے۔ کسی کے پاس ایسا علمی و تصنیفی سرمایا اس کے والد محترم ہی کے ذہن و قلم کا نتیجہ کیوں نہ ہو۔ یہ Intellectual property پر ڈاکا ہے جو جعل سازی اور غلط کریڈٹ لینے کے زمرے میں آئے گا۔ البتہ ایسا علمی خزانہ خام اور قدرے منتشر صورت میں ہو لیکن اس کا بنیادی کام انجام پا چکا ہو اور باقی کام کسی دوسرے شخص کو کرنا پڑے تو اس صورت میں اس کی ترتیب و تہذیب کرنے والا اپنا نام بطور مرتب یا معاون مصنف کے درج کر سکتا ہے۔ یہ سارا عمل اور سارا معاملہ کسی علمی سرمائے کے وارث بن جانے والے کی نیک نیتی اور خوش خصالی پر منحصر ہے کہ وہ کہاں تک انصاف کر پاتا ہے۔ ایسے علمی خزانے کی اشاعت کی درج ذیل صورتیں ہو سکتی ہیں:

i. اگر کام مکمل ہے تو اس کے اصل مصنف کے نام سے شائع ہو۔

ii. تصنیف و تحریر اور استخراج نتائج کا کام مکمل ہے لیکن منتشر ہے اور تعارف و ترتیب و حواشی کا محتاج ہے تو اس کی ترتیب و تہذیب انجام دینے والا اصل مصنف کا نام درج کرنے کے بعد خود کو مرتب کے طور پر ظاہر کرے۔

iii. اگر نامکمل کام ہے تو اس کو مکمل کرنے والا خود کو معاون مصنف کے طور پر ظاہر کر سکتا ہے۔

iv. اگر کسی کام کا محض منصوبہ تیار ہوا تھا یا اس کا کچھ مواد جمع تھا اس صورت میں اس کام کو آگے بڑھانے والا اور اس کی تصنیف و تالیف کے بعد اسے مکمل کرنے والا خود کو مصنف ظاہر کرے تو اس کو زیب دیتا ہے اور یہ اس کا حق ہے۔

۹. خود لکھ کر دوسروں کے نام سے چھپوانا بظاہر کوئی برا فعل خیال نہیں کیا جا سکتا اس وجہ سے کہ اس سلسلے میں محض یہ سوچا جاتا ہے کہ اگر ایک شخص کوئی تحریر لکھتا ہے اور وہ کسی دوسرے کی ضرورت یا شوق کے لیے اسے دان کر دیتا ہے تو یہ اس کا اختیار ہے لہٰذا وہ جسے دے دے وہ اسی کی تسلیم کرنی چاہیے کیونکہ اس نے اپنی مرضی سے عنایت کی ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ یہ معاملہ بھی فکری سرمائے (Intellectual property) کا ہے۔ اگر تحقیق سے تعین ہو جائے کہ اس کا اصل مصنف کون ہے تو وہ اسی کے کریڈٹ میں جانا چاہیے۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہاں بات صرف مرضی اور اختیار کی نہیں کہ اصل مصنف نے کسی کو محض نوازا ہے۔ اس بحث میں ایسی مثالیں بھی آ جاتی ہیں جب کوئی کسی دوسرے کے بارے میں غلط نظریات پھیلانا چاہے یا کسی کا تاثر بگاڑنا چاہے تب بھی بعض لوگ ایسا کر لیتے ہیں کہ خود لکھ کر دوسرے کے نام سے شائع یا نشر کر دیا جائے۔

فرضی ناموں سے لکھی گئی تحریریں اور کتابیں بھی اسی ذیل میں آئیں گی۔ یہاں بھی دونوں طرح کے طبقے ہو سکتے ہیں مجبوراً فرضی نام سے لکھنے والے اور کسی کا تاثر بگاڑنے کے لیے فرضی نام سے لکھنے والے۔ فرضی نام سے لکھنے والوں کی مجبوریاں اور وجوہات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ بعض حکومت یا کسی دوسرے مقتدر ادارے یا شخص کے خوف سے فرضی نام سے لکھتے ہیں۔ بعض اشاعتی ادارے یا اخبارات جو لکھنے کا معاوضہ دیتے ہیں ان سے وابستہ قلم کاروں کو عموماً ایک چیز کا معاوضہ ملتا ہے جبکہ ان کی ضرورت بھی زیادہ ہوتی ہے اور وہ زیادہ لکھ بھی سکتے ہیں اس لیے پھر وہ دیگر تحریریں فرضی ناموں سے لکھتے ہیں۔ ایسے بہت سارے علمی سرمایے کا تعین ہو بھی چکا ہے یا بعض فرضی نام سے لکھنے والوں نے بعد میں خود نشاندہی کر دی۔ اس بحث میں سے دوسروں کا تاثر بگاڑنے کے لیے اُن کے نام سے یا کسی فرضی نام سے لکھی جانے والی تحریریں اخلاقیاتِ تحقیق کے منافی ہی سمجھی جانی چاہیں۔ یوں سرقہ اور جعل سازی کی ایسی تمام صورتیں اور ان

کے علاوہ بھی ایسے مزید حربے اور طریقے جو اخلاقیاتِ تحقیق و تصنیف کے منافی ہوں قابل مذمت اور قابل جرم سمجھے جانے چاہییں۔

حوالہ جات

۱۔ تحقیق، مشترکہ شمارہ ۱۱-۱۰، جامشورو: شعبۂ اردو، سندھ یونیورسٹی، ۱۹۹۷-۱۹۹۶ء، ص ۳۴۷

۲۔ جریدہ (سرقہ نمبر)، شمارہ ۲۷، کراچی: شعبۂ تصنیف و تالیف، جامعہ کراچی

۳۔ اثبات (سرقہ نمبر)، لاہور: عکس پبلی کیشنز، دوسرا ایڈیشن ۲۰۱۸ء

۴۔ محمد حسین آزاد، آب حیات (مع حواشی، تعلیقات اور اختلاف نسخ) ترتیب و تدوین، ابرار عبد السلام، ملتان: بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، بار اوّل، مارچ ۲۰۰۶ء، ص ۲۱۰

۵۔ جواز جعفری، ڈاکٹر، اقبال ساجد: شخصیت اور فن، اسلام آباد، اکادمی ادبیات، ۲۰۱۰ء، ص ۲۸-۲۲

۶۔ انور سدید، "اجرت پر مقالہ لکھنے والے کی بد دیانتی" ، اثبات (سرقہ نمبر) محولہ بالا، ص ۴۶۳

۷۔ نجیبہ عارف، "سیر ملک اودھ از یوسف خاں کمبل پوش"، بنیاد، جلد ۶، لاہور: گرمانی مرکز زبان و ادب، لاہور یونیورسٹی آف مینجمنٹ سائنسز، ۲۰۱۵ء، ص ۱۲۷

۸۔ مظہر احمد، ڈاکٹر، "مقدمہ" ، سیر ملک اودھ از یوسف خاں کمبل پوش، مقدمہ حواشی فرہنگ؛ ڈاکٹر مظہر احمد، نئی دہلی: ایم۔آر- پبلی کیشنز، ۲۰۱۹ء، ص ۱۰

۹۔ ایضاً، ص ۱۳-۱۲

۱۰۔ ایضاً، ص ۱۴-۱۳

۱۱۔ ایضاً، ص ۱۳

۱۲۔ ایضاً، ص ۱۴

۱۳۔ محمد سعید، رشید حسن خاں اور ان کی علمی و ادبی خدمات، (مقالہ برائے پی ایچ ڈی اردو)، فیصل آباد: شعبۂ اردو، جی سی یونیورسٹی ۲۰۱۳ء، ص ۱۲۴، مخزونہ: محمد سعید، موبائل نمبر ۰۳۰۰۴۷۰۳۱۷۶

۱۴۔ اسحاق صدیقی، بحوالہ: اثبات (سرقہ نمبر)، لاہور: عکس پبلی کیشنز، دوسرا ایڈیشن ۲۰۱۸ء